

درد کی لکڑی



دس مرلے پر بنا پکا اینٹوں کا دو منزلہ عجب صورت
گھر۔ فردوس بیگم نے جب اس گھر میں قدم کھاتو ان
کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ برسوں کا خواب آج
حقیقت کی صورت میں سامنے تھا۔
”سب سے پہلے جائے نماز بچھا کر نفل ادا کیے پھر پلوں
پلوں کے ساتھ سامان سیٹ کروانے کے لیے ملازم اور
اپنے دونوں لڑکوں کو ہدایت دینے لگیں۔
سامان کا سیٹ ہو جانا چھ گھنٹوں یا ایک دن کا کام

نہیں تھا اس میں وقت لگنا تھا مگر فردوس بیگم چاہتی
تھیں سب کچھ آج ہی سیٹ ہو جائے۔ جرمنی میں
رہنے والے بڑے لڑکے کو فون کیا اور اپنے گھر میں
شفٹ ہونے کی خوش خبری سنائی۔
”سچ تو یہ ہے بیٹا! کہ سب تمہاری محنت کا نتیجہ ہے
کہاں میرا یہ خواب پورا ہوتا تھا۔ بس دعا کرو کہ
ہمیں اس بھی آجائے۔“

”بہن! اس آنے والی کیا بات ہوئی امی؟“ لکھی جب
فون پر اس نے سنا تو چھوٹا بیٹا پوچھنے لگا۔
”بس بیٹا! یہ جگہیں ایسی ہوتی ہیں جو کینوں کو
راس نہیں بسی آتیں۔ اس لیے سب سے پہلے میں
نے نفل ادا کیے ہیں۔ بیٹا! ادھر پچھلی گلی میں جرنل
اسٹور ہے۔ جاؤ دودھ کا پکٹ اور کئی وغیرہ لے آؤ۔
چائے کو بی چاہ رہا ہے۔ فردوس بیگم کے میاں نے
بیٹے سے کہا۔

”بس آپ پر ہر وقت چائے کا شوق ہی سوار رہتا
ہے۔ دیکھتے نہیں کتنا کام پھیلا ہوا ہے۔ اس وقت
چائے بنانے کے لیے کوئی فارغ نہیں ہے۔“ جواب
بیگم کی طرف سے ملا۔

”میں خود بنا لوں گا۔“ صاحب چائے بننے کے اذہد
شوقین تھے اور اسے بنانے میں بھی انہیں کوئی عار
نہیں تھا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بڑے کمرے میں چلی
گئیں۔

انہیں یہاں آئے تیسرا دن تھا۔ عادت کے مطابق
وہ آس بڑوس میں خود مل آتی تھیں یہ انتظار نہیں کیا
کہ وہ لوگ پہلے ملنے آئیں۔ سادہ سے لوگوں کا محلہ تھا

ناولٹ



جہاں آسودہ حال پڑھا لکھا مڈل کلاس طبقہ آباد تھا۔ یہاں زمین ان کے سر مرحوم نے خریدی تھی مگر مکان بنانے کی حسرت ہی رہی۔ ان کے میاں بھی کوشش کرتے رہے مگر اس مہنگائی کے دور میں بھی اتنا بچا ہی نہیں پائے۔ فردوس بیگم کو اپنے گھر کا بہت ارمان تھا اکثر میاں سے ذکر کرتیں۔

”سنو جی جب ہم مکان بنائیں گے تو اس کا گیٹ بالکل ملک صاحب کے گھر کے گیٹ جیسا ہو گا۔ ہم کچن کشادہ بنائیں گے اور میرے بید روم میں شیشے کی کھڑکی ضرور ہونی چاہیے۔“

وہ سنے جاتے اور چائے کی چسلیاں لیتے ہوئے مسکرا کر اثبات میں سر ہلائے جاتے۔ اس دور میں بیوی اس پلاٹ کو دیکھنے بھی جاتے اور خیالوں میں یہاں شاندار سا گھر کھڑا کر دیتے۔ مگر وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ پھر تو وہ شوہر سے لگیں تھیں۔

”جیسے اب میاں گھر بنانے کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہوئے ہمارے ساتھ بھی ایسا ہو گا۔ اس آمدن میں ہم کبھی گھر نہیں بنائیں گے۔“

وہ تو جب بڑے بیٹے کی قسمت نے پاور کی وہ جرمنی پہنچا اور جانے کے لیے تیار ہی اچھی خاصی رقم بھی بھیج دی تو مارے خوشی کے دونوں میاں بیوی ساری رات سو نہیں سکے۔ پھر وہ رقم کو ہر ماہ بچھال کر رکھتے رہے اور اب یہ خوب صورت گھر اس کفایت شعاری کا انعام بن کر ان کے سامنے تھا۔ تین بیٹے تھے ان تینوں سے بڑی بیٹی بھی جو بیاہی ہوئی تھی اسے پیغام بھیجوادیا تھا۔

”میاں اور بچوں کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے آکر ہمارا خوابوں کا محل بھی دیکھو اور ہماری اداسی بھی دور کر دو۔“

بیٹی نے جلد آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور ان ہی دنوں وہ محلے کا چکر بھی لگا آئیں۔ اس پڑوس اچھا لگا تھا اور کسی بھی جگہ پر رہتے ہوئے سب سے بڑی نعمت اچھا اس پڑوس ہی ہوا کرتا تھا۔ بیانی

کی دیگ پکوا کر گلی کے سب گھروں میں دینے کا ارادہ تھا مگر یہ کام بھی بیٹی کے آنے پر رکھ چھوڑا تھا اس کے بچے چھوٹے تھے اور بچوں کے لیے یہ سب ہلکی دلچسپی کا باعث ہوا کرتا ہے۔

نانا، تانی، ماموں پہلے بھی بچوں پر جان دیتے تھے اور اب جب سے گھر میں باہر کا پیسہ آنے لگا تھا۔ بات ہی دوسری تھی بچوں کی تو جیسے مون ہی ہو گئی تھی۔



ایک دن فردوس بیگم پڑوس میں گئیں تو وہاں دو لڑکیاں آئی بیٹھی تھیں۔ سانولی سلونی عام سے نقوش عمر میں بھی تیس کے قریب قریب لیکن وہ شادی نہیں ہوئی تھیں۔ جس چیز نے فردوس بیگم کو چونکا دیا ان کے چہروں پر پھیلی گہری سنجیدگی اور ویرانی تھی۔ بھلے رنگوں کے کپڑے اور چہرے کے بھی پچھلے رنگ۔

”یہ کون ہیں؟“ انہوں نے پڑوس کی لڑکی سے پوچھا۔

”وہ تو اس پچھلی گلی میں رہتی ہیں۔ وہ ہمارے بل کے دوست کے اسکول کھولا ہے نا، ادھر چاب چاہتی ہیں اسی لیے آئی ہیں ورنہ یہ کم ہی کہیں آتی جاتی ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ لڑکیاں اجازت لے کر چلی گئیں۔ فردوس بیگم نے ان کی کوئی بات نہیں ہو سکی۔ پھر پڑوس کے ساتھ باتوں میں لگ کے ان لڑکیوں کو بھول ہی گئیں۔

دوسری بار انہوں نے ان ہی دنوں لڑکیوں کو اپنے برابر والے گھر میں ہونے والی شادی پر دیکھا۔ ان دنوں پہلے سے کافی بہتر چلے میں تھیں مگر ان کے کپڑے آج بھی کسی چمک دمک سے خالی بالکل سادہ سے تھے جو لڑکی بھی اور میک اپ سے قطعی بے نیاز ان کے پھیکے پھیکے چہرے اس تقریب سے قطعی میل نہیں کھاتے تھے۔ ان کے ساتھ ان ہی کی ہم عمر ایک شادی شدہ لڑکی بھی تھی۔ جس کے دو شرارتی سے بچے

تھے اور وہ تقریب پر کیا دھیان دیتی۔ انہیں ہی سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی اور یہ دونوں ان ماں بیٹوں سے بالکل لاعلمی رکھتی تھیں۔
”یہ لڑکیاں کون ہیں بیٹا؟“ انہوں نے پھر ایک محلے کی لڑکی سے پوچھا۔

”یہ دردانہ اور کاشفہ باجی ہیں اور ان کے برابر جو خوب صورت سی خاتون ہیں وہ ان کی بھابھی زرین ہیں اور یہ دونوں بچے زرین بھابھی کے ہیں۔“
”ان دونوں بہنوں کی شادی نہیں ہوئی؟“ انہوں نے مزید جاننا چاہا۔

”نہیں آئی! ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی اور شاید ہوگی بھی نہیں۔“ لڑکی چپ چاپ کر کے آگے بڑھ گئی مگر وہ اس کی بات کو بھلا نہیں سکتی تھیں۔

”کیوں نہیں ہوئی ان کی شادی؟“ کل اتنی عمر عام ہے اور شکل و صورت پر اگر ذرا توجہ دیں تو بری تو ہرگز نہیں ہیں۔ ہاں ان کی بھابی بہت خوب صورت ہے بس اس کے چہرے کے بائیں جانب تھوڑی سی قریب جو گہرا نشان ہے وہ بالکل رہا ہے۔ مگر ایک دوسرے سے کتنی لا تعلق ہیں۔

پوری تقریب میں ان کی نظریں بار بار ان لڑکیوں کی جانب اٹھتی رہیں۔ لگتا تھا انہیں اس ساری تقریب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس مارے باندھے ہی بیٹھی ہیں جبکہ ان کی بھالی ہر ایک سے بہت اچھی طرح مل رہی تھی اور تقریب کا حصہ دکھائی دیتی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ ان کی جانب آئی۔

”السلام علیکم آئی! مجھے پتا چلا آپ اس محلے میں نئی آئی ہیں۔ یہاں آپ نے اپنا گھر بنایا ہے۔ بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ یہ گھر آپ کے لیے ہر طرح سے بابرکت کرے۔“

وہ بڑے خلوص سے کہہ رہی تھی مگر انہیں وہ کچھ اچھی نہیں لگی۔ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ گھر سے باہر بے حد بااخلاق مگر گھروالوں کے ساتھ ان کا رویہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ فردوس بیگم کو زرین بھی کچھ ایسی ہی لگی تھی۔

مگر پہلی ملاقات میں جبکہ وہ بڑے اخلاق سے انہیں خود ملنے کے لیے آئی تھی۔ وہ بے زاری اور لاعلمی کا مظاہرہ تو نہیں کر سکتی تھیں۔ سو مسکرا کر اسے اپنے بارے میں بتایا اور گھر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔

”میں ضرور آؤں گی۔“ اس نے بڑی محبت سے کہا تھا۔ اور واقعی وہ ایک شام گھر آ بھی گئی۔ انگوری کمر کے گرم سوٹ میں ہلکا سا میک اپ کیے وہ آج بھی خاصی فریش اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ گھر آئی مہمان سے فردوس بیگم بھی بڑے تپاک سے ملیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس کی دونوں نندوں کے بارے میں پوچھا۔

”ہاں وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ گھر پر ہی ہیں۔“
”میں بھی ساتھ لے آئیں۔“

”میں آپ کا پیغام انہیں دے دوں گی اگر وہ آنا چاہیں گی تو کسی روز آجائیں گی۔“

”انہیں اسکول کی جاب ملی یا نہیں۔“ میں کافی روز پہلے ایک پڑوسن کے ہاں گئی تھی وہ ہیں وہ دونوں بیٹھی ہوئی تھیں اور مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ جاب کرنا چاہتی ہیں۔

فردوس بیگم کو ان لڑکیوں میں دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ کسی رات میں وہ سوشل ورک بھی کرتی رہیں تھیں اور آج جب انہیں وہ لڑکیاں مظلوم اور مدد کی مستحق لگ رہی تھیں تو وہ انہی کے بارے میں بات کیے جا رہی تھیں۔

”نہیں آئی! انہیں جاب تو نہیں ملی۔ ویسے مجھے نہیں معلوم کہ وہ کوئی جاب کرنا چاہ رہی تھیں یا بھی تک تو گھر پر ہی ہوتی ہیں ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں کچھ عرصے بعد جوائن کرنے کو کہا گیا ہو۔“

وہ سوچ سوچ کر جواب دے رہی تھی۔
”کمال ہے بیٹا! آپ سے انہوں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ شاید اپنی والدہ کو بتایا ہو گا۔“

”نہیں آئی! ان کی والدہ اور والد دونوں ہی حیات نہیں ہیں۔ میرے میاں اور ان سے چھوٹے ان کے دو ہی بھائی ہیں۔ یہ دونوں ہمارے ساتھ رہتی ہیں جبکہ

میرا دیور اور ان کی مسز الگ گھر میں اسی شہر میں رہتے ہیں مگر ان دونوں کی طرف ان بہنوں کا آنا جانا نہیں ہے۔

”اچھا، کمال ہے۔ بھائی کے گھر نہیں جاتیں۔“ وہ پھر چونکی۔

زرین مسکرا کر چپ ہو رہی۔ یقیناً ”وہ ایسی عورتوں میں سے نہیں تھی جو پہلی ملاقات میں ہی خاندان کی ہر اچھائی برائی بیان کر جاتی ہیں۔ آج وہ انہیں پہلے سے زیادہ بھلی اور نفیس مزاج کی لگی تھی اور اس نے انہیں اپنے ہاں آنے کی پر زور تاکید بھی کی تھی۔“

وہ تو خود اس کے گھر جانا چاہتی تھیں۔ ان کی بیٹی آئی تو وہ اسے ساتھ لے کر چلی گئیں۔ زرین کے بچوں کا پورا اہوا تھا اور وہ اسے بچوں کی پڑھائی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ان دونوں بہنوں نے بڑے روئے سے انداز میں فردوس بیگم اور ان کی بیٹی کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بد دل سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ اور خود بیوی کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

انہوں نے دیکھا۔ لاؤنج خاصا کشادہ تھا۔ فرنیچر بھی اچھا تھا، مگر تھوڑی بہتری محسوس ہو رہی تھی۔ چائے کے دو خالی کپ، بکھرا ہوا اخبار اور ایسی کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں۔

”جس گھر میں تین تین لڑکیاں موجود ہوں وہاں ایسا تو نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ بس سوچ کر رہ گئیں۔ اتنے میں زرین آگئی۔ انہیں دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ بیٹی سے اپنائیت سے ملی پھر جلدی جلدی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگی۔

”پلیز آئی! مائنڈ مت کیجیے گا۔ میں نے چولہے پر سبزی رکھی ہے بس ایک نظر ڈال کر آرہی ہوں۔“ جب وہ آکر ان کے پاس بیٹھیں تو لڑکیاں اٹھ کر چلی گئیں۔

فردوس بیگم کافی دیر ان کے ہاں بیٹھی کہ زرین کے

انداز میں جو اپنائیت اور بے تکلفی تھی، وہ بیٹھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اور جب تک وہ بیٹھی رہیں، دونوں لڑکیاں کمرے میں نہیں آئیں۔

زرین ہی ان کے لیے چائے بنا کر لائی اور بار بار کچن کے چکر بھی لگاتی رہتیں۔

پھر اس کے بعد تو فردوس بیگم اکثر ان کے ہاں آنے جانے لگیں۔ زرین بھی چکر لگاتی مگر وہ زیادہ دیر بیٹھی نہیں تھی کہ اسے کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا۔

”تمہاری سندیں ہیں نا گھر میں، وہ دیکھ لیں گی۔“

”خاک دیکھیں گی۔ سب خراب کر کے رکھ دیں گی۔ انہیں کسی کام کا سلیقہ نہیں ہے۔“

پھر ایک روز جب وہ زرین کے ہاں آئیں اور وہ اسے لے کر چائے بنانے کو اٹھنے لگی تب انہوں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

”یہ کاشفہ بیٹھی ہے نا۔ اسے کہو بنا لے گی۔“

زرین استہزائیہ انداز میں منستے ہوئے بولی۔

”چائے تو یہ بنا ہی لے گی مگر اسے حلق سے

اٹا لے گا، وہ ان دونوں سے کام کروانے کے بعد سوائے کچھ اور کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ سلیقہ کہتے ہیں اس نام سے ان کی فیملی کی خواتین بالکل ناواقف ہیں۔ میری ساس بھی ایسی تھیں۔ سچی جب میں اس گھر میں بیاہ کر آئی تو گھر کی حالت اور ان کے ہاتھ کے بد مزہ کھانے کے بعد خود کسی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔“

اس کی بات پر کاشفہ نے کمرے تیروں سے اسے گھور کر دیکھا مگر بولی کچھ نہیں، زرین اپنی ساس کے پھوٹرن کے قصے سنائے چلی جا رہی تھی اور فردوس بیگم کاشفہ کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ کاشفہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی اور اس کے جاتے ہی زرین نے بھی موضوع تبدیل کر دیا۔ گویا وہ یہ سب کاشفہ کو ہی سنارہی تھی۔ گھر آکر بھی ان کے ذہن سے زرین کی باتیں اور کاشفہ کی بے بسی نہیں نکل سکی تو گویا ان کا اندازہ زرین کے بارے میں غلط نکلا۔ وہ اتنی اچھی ہرگز نہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	150/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	300/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	150/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	400/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	400/-
پھلاں دے رنگ کا لے	فائزہ افتخار	180/-
صحن سے عورت	غزالہ عزیز	150/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ مرزا	300/-
بکھرتا جائیں خواب	آسیہ مرزا	150/-
خواب در پہچے	سعدیہ کاشف	150/-
لہاؤں کا چاند	شری سعید	150/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	انفشاں آفریدی	400/-
درد کے فاصلے	رضیہ جمیل	400/-
آج کل من پر چاند نہیں	رضیہ جمیل	180/-
درد کی منیلا	رضیہ جمیل	150/-
میرے دل میرے مسافر	نسیم سحر قریشی	250/-
تیری راہ میں دل کی	میمونہ خورشید علی	150/-
شام آرزو	ایم سلطانی فخر	300/-
برگ گل	ایم سلطانی فخر	300/-
اے وقت گواہی دے	راحت جنیں	300/-

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 30/- روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 2216361

تھی جتنا وہ سمجھ بیٹھی تھیں۔
ان کا جی چاہا وہ ان دونوں کو اپنے پاس بٹھا کر ان کے
دل کی بات پوچھیں اور ان کی دوست بن جائیں۔
”بے چاری بن ماں کی لڑکیاں یہ عمران کی شادی کی
سے مگر زرین بھلا کہاں اس بارے میں سوچتی ہو گی۔“
وہ مکمل طور پر زرین سے متنفر ہو چکی تھیں۔

اس دن کے بعد وہ دوبارہ اس کے گھر گئیں بھی
نہیں۔ زرین نے بڑے لڑکے کے ہاتھ پیغام بھی
بھجوایا۔ ایک بار اس کے گھر سے کوفتوں کا ساکن بھی
آیا مگر وہ خود کو اس کے ہاں جانے پر آمادہ نہ کر سکیں۔
محلے میں کسی دوسرے گھر گئیں تو وہاں یہ دونوں بہنیں
آئی بیٹھی تھیں، کھانا دیر سے بیٹھی تھیں کہ اب
انھیں کی اجازت طلب کی جائے۔ میرزا نے رسماً
بھی رکنے کو نہیں کہا اور وہ چلی گئیں۔

”کیا کتنے آئی تھیں؟“ ان کے جانے کے بعد
انہوں نے خاتون خانہ سے پوچھا۔
”میں ہر ماہ ڈائجسٹ لیتی ہوں تاکہ تو پرانے ڈائجسٹ
یہ لے کے آتی ہیں۔“
”اچھی بچیاں ہیں بے چاری!“ انہوں نے دھڑ
بھرتے انداز میں کہا۔ خاتون نے چپ چاپ سر انبات
میں ہلایا پھر ان سے چائے کے بارے میں پوچھنے لگی۔

وہ زرین کے ہاں نہیں گئیں تو ایک روز زرین خود
ہی چلی آئی۔

”میں آنا تو چاہتی تھی مگر تمہارے ہاں آکر میں
بہت بے چین ہو جاتی ہوں۔“ آج انہوں نے صاف
بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”کیا مطلب آئی! میں سمجھی نہیں؟“ اس کی حیرت
بجا تھی۔

”تمہارے گھر میں وہ جو دو گم صم لڑکیاں رہتی ہیں نا
”انہیں دیکھ کر دل دکھتا ہے۔ وہ ان کے بھائی کا گھر ہے
زرین! مگر وہ کسی مجرم کی مانند زندگی کے دن پورے کر
رہی ہیں۔“

”اور آپ اس سلسلے میں مجھ سے ناراض ہیں۔ اس
اتوار کو میری طرف آئے گا۔ بچے اپنی خالہ کے ہاں
چھٹی گزارنے جا رہے ہیں اور میرے میاں کے
دوست کی شادی ہے، وہ سارا دن ادھر ہی مصروف
رہیں گے۔ آپ آئے گا پھر تفصیل سے ساری بات
ہوگی۔“

بولتے تھے اور دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے تھے۔ انہوں نے رشتہ کرنے سے پہلے معلومات تو کروائیں مگر بہت زیادہ نہیں۔ اور میری والدہ تو گھر سے ہی بہت کم نکلتی تھیں۔ انہیں لوگوں کا تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا اور میری ساس جب تک رشتہ طے نہیں ہوا بہت میٹھے انداز میں بات چیت کیا کرتی تھیں۔ مگر بات چیت ہونے کی رسم ادا ہوتے ہی ان کے انداز میں کچھ تبدیلی آگئی۔ ہماری جانب سے دی گئی ہر چیز پر انہوں نے اعتراض کیا اور بتایا۔

بھالی کے جینز کے جوڑوں
 لیا کرتی ہیں۔
 میں ان لوگوں سے بنا کر
 اب مجھے پیسے رہنا تھا۔ یہ دونوں
 کے ساتھ جاتی تھیں کہ
 میرا دیور راشدا اپنے گھر
 میں ہوتی تھی۔ میرا دیور
 خوش مزاج شخص تھا اور اپنی ماں
 سے زیادہ زیادہ نہیں تھا۔ اس نے گھر
 میں کچھ زیادہ چلتے پھرتے دیکھا
 میری طرح سر جھکائے مگرانی کرتے
 ہی کاموں کی نگرانی کرتے
 رہتا تھا۔

ان دونوں بہنوں نے چھانٹ کر دوسوٹ اپنے لیے لے لے کر کہہ کر کہ

”ہمارے ہاں رسم ہے بھالی کے جینز کے جوڑوں سے منڈیں اپنے لیے جوڑے لیا کرتی ہیں۔“

میں خاموش رہی کہ ہر حال میں ان لوگوں سے بنا کر رکھنا چاہتی تھی کہ اب مجھے یہیں رہنا تھا۔ یہ دونوں کالج جاتی تھیں اور ایسی تاری کے ساتھ جاتی تھیں کہ مجھے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ میرا دیور راشد اپنے گھر میں سب سے زیادہ خوش مزاج شخص تھا اور اپنی ماں کے کنٹرول میں بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اس نے گھر میں مجھے کسی مجرمل طرح سر جھکائے چلتے پھرتے دیکھا اور اپنی ماں کو ہر وقت میرے ہی کاموں کی نگرانی کرتے اور ان میں نقص نکالنے کی کوشش کرتے۔

”امی! یہ کیا تان میں بھیج رہی ہیں عزت ہیں اس گھر کی۔ آپ کس طرح بات کرتی ہیں ان سے۔“

اس روز میرے دھوئے ہوئے کپڑوں پر اعتراض کرتی وہ مجھے اور میری ماں کو بدسلوکی قرار دے رہی تھی جب راشد بول اٹھا۔ انہوں نے یہ سن کر کہ

اچانک منہ پر دوپٹہ ڈالا اور پیچ پیچ کر روئے لگیں۔ یہاں تک کہ آفس سے آکر کپڑے تبدیل کرنے باتھ روم میں گیا، واشنگ اور اندر لیٹے اس کے والد دونوں باہر آگئے۔

”کیا ہوا؟ کیا ہوا؟“ دونوں گھبراہٹ سے پوچھنے لگے۔

”میں لٹ گئی، برباد ہو گئی میرے گھر میں میری آنکھوں کے سامنے نقب لگ گئی۔“ وہ باقاعدہ سینے پہ دو ہتھ مار رہی تھیں اور ہم میں سے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”اری یہ تو سوچ لیتی۔ یہ دیور سے تیرا تیرے خصم کا چھوٹا بھائی۔ اس پر ڈرے ڈالنے لگی ہے۔ اس کے منہ میں اپنی زبان ڈال دی ہے۔“

ایسے الزام پر میں اور راشد ہکا بکا رہ گئے۔ واشنگ آگے بڑھا اور اس نے سب کے سامنے مجھے بری طرح پیٹ ڈالا۔

راشد آگے بڑھا اور قسمیں کھا کر بھائی کو اپنی۔

بے گناہی کا یقین دلانے لگا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ وہ مجھے بہن سمجھتا ہے۔ ”پتا نہیں واشنگ کو یقین آیا یا نہیں۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا اور ماں اس کا سراپے سینے سے لگا کر کہنے لگی۔

”چل چھوڑ بھائی کی طرف سے دل میلانہ کر۔ یہی میسنی چندال ہے۔“

”میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ بھیج دو اسے واپس۔ میں جلد ہی کانڈ بھجوا دوں گا۔“

”ہائے ہائے شریفوں کے گھروں میں کب ایسا ہوتا ہے؟“

انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے میں لے گئیں۔ اس کے بعد راشد اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میرے

سر کے اپنے کمرے کی راہ لی۔ اور یہ دونوں بہنیں میرے سامنے بیٹھی میرا مذاق اڑاتی رہیں کہ واشنگ نے

مجھ پر ان سب کے سامنے ہاتھ اٹھا کر میرے جسم کی ہی نہیں میری روح کی بھی تذلیل کی تھی۔ میں تو نیم۔

بے ہوش سی فرش پر پڑی تھی اور اپنی موت کی دعا مانگ رہی تھی۔

”چل نی! اٹھ مر دو جوڑے ہال اپنے بیگ میں۔“

کچھ دنوں کے لیے رفع ہو جائی ماں کے گھر۔ واشنگ کا غصہ اُٹھتا ہوا گاتولے آؤں گی تجھے۔“

کچھ دیر کے بعد میری ساس نے کمرے سے برآمد ہو کر واشنگ سے مجھے مخاطب کیا تھا اور میں نے

دل میں سوچا تھا اب کبھی اس گھر میں نہیں آؤں گی۔

مگر میکے آکر سب اپنی دو جوان بہنوں کی جانب دیکھا اور میرا جی چاہا میں پیچ کر روؤں۔ میں تو بے بس ہو

چکی تھی۔ مجھے اسی زنداں میں واپس جانا تھا۔ اگر میں

میکے میں رہ جاتی تو پھر میری یہ دو بہنیں کبھی بیاہی نہ

جائیں۔

تیسرے ہی دن واشنگ مجھے لینے آگیا۔ اس کا رویہ

خاصا بہتر تھا۔ وہ مجھے میکے سے سیدھا گھر نہیں لایا بلکہ

ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی اور بولا۔

”راشد نے مجھے بتایا ہے وہ تو کسی اور لڑکی کو پسند

کرتا ہے اور بہت جلد اس سے شادی بھی کر لے گا۔
وہ کہتا رہا۔ میں سختی رہی یہ سکون تو تھا اسے میری پاک
دامنی پر شبہ نہیں رہا اور یہ دکھ بھی تھا کہ میں چھ ماہ سے
اس کے ساتھ ساتھ ہوں اور یہ مجھے اتنا بھی سمجھ نہیں
پایا۔

گھر واپس آئی تو سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا بلکہ
شاید پہلے سے بھی ابتر۔

”بڑے بھٹے سے گئی تھی جیسے اب کبھی واپس
نہیں آئے گی۔ چار دن میں ہی تنگ آ گئے تیرے
بھوکے ننگے میکے والے۔“

میں سمجھ نہیں پائی تھی آخر میری ساس میرے
ساتھ ایسا رویہ کیوں رکھے ہوئے ہیں۔ میں ان کی
گدی کے لیے کسی طرح بھی خطرہ نہیں بن سکتی تھی۔
مگر پتہ نہیں انہیں کون کون سے اندیشے لڑتے تھے۔
میرے سر بیمار ہوئے اور پھر اسے آگے تبہ بچھا
انکشاف ہوا کہ جس کا کان پر وہ بیٹھتے تھے وہ ان کی اپنی
نہیں تھی بلکہ وہ وہاں ملازم تھے اور راشد نے اپنے اوپر
لگائے گئے الزام کے گھم میں گھر میں تنخواہ دینا بند کر
دی۔

ماں نے بہت برا سمجھا۔ خوشامد بھی کر ڈالی مگر وہ اس
معاملے میں ماں پر ہی پڑا تھا۔ ذرا بھی ٹس سے مس
نہیں ہوا اور گھر بھی دیر سے آنے لگا۔

اب صرف گھر میں واثق کی تنخواہ آرہی تھی اور ان
کی ماں اس سب کا الزام مجھے دیتی تھیں اور اب وہ
واثق کو مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش جی جان سے
کرنے لگی تھیں۔ ماں بیٹیوں کا رویہ میرے ساتھ
ہتک آمیز تھا۔ وہ اب بھی مجھے کلسانے کے لیے
میرے نام کے ساتھ راشد کا نام لیتیں اور میرے
والدین کی تربیت کو کوسی تھیں بس میرے لیے اتنا کافی
تھا کہ واثق کو اس بات کے بے بنیاد ہونے کا یقین آگیا
تھا مگر ایک پاک باز عورت کے لیے ایسا الزام کیسی
ازیت رکھتا ہے اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی
نہیں۔

مجھے ان ماں بیٹیوں سے نفرت ہو چلی تھی۔ میرا جی

چاہتا تھا میں اپنی ساس کا کوئی حکم نہ مانوں۔ جب
گالیوں کو سنوں کے درمیان مجھے کوئی کام کے تو صاف
انکار کر دوں مگر انکار کی مجال کہاں تھی۔ ایک بار وقت
پر کام نہیں کیا تو انھوں نے میرے کمرے میں آکر مجھے
بالوں سے پکڑ کر کہا تھا۔

”سمجھتی کیا ہے خود کو۔ کسی روز مٹی کا تیل چھڑک
کر آگ لگا دوں گی۔“

اور میں جل کر مرنا نہیں چاہتی تھی۔

زندگی بڑی مشکل اور اذیت ناک تھی۔ ان ہی
دنوں مجھے اپنے وجود میں نئی زندگی کی نوید ملی۔ واثق
بہت خوش تھا۔ جبکہ میری ساس اور نندوں نے اس
بات پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ

شاید اب میرے حالات میں کچھ فرق پڑ جائے میرے
لیے نہ سہی اس آنے والے بچے کی خاطر ہی سہی
جس سے ان کا بھی گہرا رشتہ بنتا تھا۔ وہ میرے حال پر
بھی رحم کھالیں مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہاں واثق اب
پہلے سے زیادہ میرا خیال رکھنے لگا مگر وہ صبح کا گناہ کو
بھولتا تھا اور میرا سارا دن تو اپنی ساس کے رحم و کرم
پر ہی گزرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میری ساس اپنے
کمرے میں جا کر سو جاتی تھیں اور میں بھی اگر کوئی کام
نہ ہوتا تو کمرے میں آجاتی تھی۔

اس روز میں وہے ہوئے کپڑے تہہ کرنے کے بعد
ایک چھوٹا کمرہ تھا جس کا دروازہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا یہ
کمرہ راشد کے کمرے کے برابر تھا اور وہ اپنے دوستوں
کو بٹھانے کے لیے یہی کمرہ استعمال کرتا تھا۔ یہاں میز
کرسیاں رکھی تھیں اور بڑی والی دردانہ روزانہ ہی ادھر
کی جھاڑ پونچھ کرتی تھی۔ میں کپڑے رکھنے اسٹور میں
آئی تو مجھے ادھر سے ہی باتوں کی آواز آئی۔ یہ راشد کے
آنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ صبح کا گیاسات آٹھ بجے شام
سے پہلے واپس نہیں آتا تھا کون ہو سکتا ہے؟ میں
ایسے معاملات میں دلچسپی نہیں لیا کرتی تھی مگر اس روز
تجسس نے سراٹھایا اور میں ادھر چلی آئی۔
یہاں آکر میں نے دردانہ کو ایک اجنبی کے ساتھ

کے درمیان مجھے کوئی کام نہ تھا۔
کار کی مجال کہاں تھی۔ ایک
ہوں نے میرے کمرے میں
تھا۔

خود کو۔ کسی روز مٹی کا تیل

را نہیں چاہتی تھی۔

اور اذیت ناک تھی۔ ان

میں نئی زندگی کی نوید ملی۔

میری ساس اور نندوں نے

مار نہیں کیا تھا۔ میرا خیال تھا

ت میں کچھ فرق پڑ جائے میرے

نے والے بچے کی خاطر ہی کسی

رشتہ بنتا تھا۔ وہ میرے حال

کچھ نہیں ہوا۔ ہاں واثق اب

رکھنے لگا مگر وہ صبح کا گیارہ بجے

دن تو اپنی ساس کے رحم و کرم

لھانا کھا کر میری ساس اپنے

تھیں اور میں بھی اگر کوئی کام

تھی۔

کے کپڑے تمہارے کرنے کے بعد

آئی تھی۔ اسٹور کے برابر

وازہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا

اب رہتا تھا اور وہ اپنے دوستوں

استعمال کرتا تھا۔ یہاں میز

والی دردانہ روزانہ ہی ادھر

کے کپڑے رکھنے اسٹور میں

کی آواز آئی۔ یہ راشد کے

کا گیارہ سات آٹھ بجے شام

کون ہو سکتا ہے؟ میں

لیا کرتی تھی مگر اس روز

عرصی آئی۔

کو ایک اجنبی کے ساتھ

جس حال میں دیکھا۔ میں اپنی چیخ دبا نہیں سکی۔ میری
آواز پر وہ تیزی سے پلٹی جبکہ وہ آدمی دروازہ کھول کر گلی
میں اتر گیا۔

”دردانہ! یہ تم۔۔۔“ میری آواز پھٹ رہی تھی۔ وہ
جو کچھ دیر کے لیے گم صم سی ہو گئی تھی ایک دم سے
ہوش میں آ گئی اور میری ساس کو آوازیں دینے لگی۔
ساتھ ہی اس نے میرا بازو بھی پوری قوت سے اپنی
گرفت میں لے لیا۔

اس کی آواز پر نہ صرف میری ساس بلکہ سرور
کاشفہ بھی دردمے چلے آئے۔ اور پھر جس مکاری سے
اس نے اپنے لیے کا الزام میرے سر لگایا میں تو سوچ
بھی نہیں سکتی تھی۔

”کی حرافہ ہے۔ کالہ بابت گھر گئی۔“

میرے شور مچانے پر اس نے مجھے زور سے دھکا

دے کر چھوڑ دیا۔ درد کی شدید ہیر میں نے اپنے وجود میں

لپٹی ہوئی محسوس کی اور اس کے بعد جب مجھے ہوش

آیا تو میں ہسپتال میں تھی۔ میری بیٹی اس دنیا میں

نے سے پہلے ہی دنیا سے منہ موڑ چکی تھی۔

”اب مجھے اس گھر میں کبھی نہیں جانا“ میں نے

توتے ہوئے اپنی ماں سے کہا تھا۔

میں نے تمہاری چھوٹی بہن کا رشتہ طے کر دیا ہے

بیٹا! اب اگر ایسے وقت میں تم گھر آ کر بیٹھ جاؤ گی تو سوچو

وہ لوگ کیا کیا مطلب نکالیں گے اور ویسے بھی یہ تو

قسمت کا لکھا تھا۔ تمہاری سندھ سمیں کھارہی ہے کہ

اس نے جان بوجھ کر دھکا نہیں دیا۔ وہ تو خود سلب ہوئی

تھی۔ سہارے کے لیے تمہیں پکڑنا چاہا تو تم بھی گر

پڑیں۔“

میں چپ ہو گئی میں نے اپنی ماں کی مجبوری کو سمجھ

لیا۔

واثق کو بھی بچوں کا بہت شوق تھا اور وہ اپنی ماں

بہنوں کے رویوں کو سمجھتا بھی تھا۔ میں نے بھی کچھ

نہیں چھپایا اور اسے صاف صاف سب کچھ بتا دیا۔

میرے خلاف ایک بار پھر اسی کی ماں بہنوں نے بہتان

باندھا تھا مگر اس بار واثق نے سرے سے یقین ہی

نہیں کیا تھا لیکن جب میں نے دردانہ کے بارے میں
یہ شرمناک سچائی بیان کی تب اس نے یقین نہیں کیا
اور چلا کر بولا۔

”تم لوگ ایک دوسرے کو بچا دکھانے کے لیے اس
حد تک کیوں گر گئی ہو؟ میں نے تم سے کوئی سوال
جواب نہیں کیے۔ مجھے اعتبار ہے تم پر، پھر تم دردانہ پر
ایسے گندے الزام کیوں لگا رہی ہو؟“

میں خاموش ہو گئی۔ میں نے سوچا۔ یہی بہت ہے
کہ واثق اب مجھے سمجھنے لگا ہے۔ باقی دردانہ کے
بارے میں وقت ایک روز خود ہی میری سچائی ثابت کر
دے گا۔

کچھ دن ہسپتال پھر میکے میں گزار کر میں گھر واپس آ

گئی۔

”میرے محلے میں اب کبھی دخل دیا تو اس سے

بھی برا ہو گا۔“

ایک دن جب میں کمرے میں اکیلی تھی۔ دردانہ

نے کمرے میں آ کر بڑے سفاک انداز میں مجھے دھمکی

دی اور جلی گئی۔

”یہ اللہ! میں کیا کروں گھر تو سکون اور امن کا گوارہ

ہوا کرتے ہیں مگر یہ گھر جو کہنے کو میرا ہے۔ یہاں

میرے لیے قیدم قدم پر خطرات ہیں۔ میری گود اجاڑ کر

ان لوگوں کی تسلی نہیں ہوگی۔“

انہی دنوں راشد نے اپنی شادی کی بات چھیڑ دی۔

یہ تو میں سر کر بھی نہ ہونے دوں۔ پتہ نہیں کون

چنڈال ہے جس نے میرے معصوم بیٹے کو پھانس لیا

ہے۔ تیرے لیے تو میں اپنی پسند سے چاند سی دلہن

لاؤں گی۔“ ماں نے لالچ دیا۔

”اور لا کر اس کا وہی حشر کریں گی جو بھائی کا کیا ہے۔

میں واثق بھائی کی طرح سادہ اور کمزور نہیں ہوں۔ جسے

لے کر آؤں گا انہی عزت بنا کر رکھوں گا۔“

”ہاں ہاں بالکل۔ بس یہ تو اپنی کرنی کے پھل ہوتے

ہیں۔ یہ کالے منہ والی تو منحوس ہے۔ تیرے لیے تو

اچھے خاندان کی لاؤں گی۔ سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھوں

گی۔“

”سر آنکھوں پر تو تب بٹھائیں گی تا جب میں اسے اس گھر میں رکھوں گا۔“

راشد کے انداز تسخّر تھا اور میری ساس کی یہ بے عزتی میرے سامنے ہو رہی تھی اور شاید یہی بات ان کی برداشت سے باہر تھی وہ زیادہ دیر اپنے لہجے پر قابو نہیں پاسکیں اور راشد سے الجھ پڑیں مگر راشد اور واثق میں جو فرق تھا۔ اس وقت وہ اسے بھول رہی تھیں۔ راشد نے کہا تھا وہ اپنی بیوی کو ان لوگوں کے ساتھ نہیں رکھے گا اور میری ساس نے کہا اگر وہ اپنی پسند کی لڑکی سے بیاہ پر بند ہے تو پھر وہ اس کی رات میں شامل نہیں ہوں گی۔

”ٹھیک ہے مت شامل ہوں۔“ اس نے اس دھمکی کو کوئی اہمیت نہ دی۔

مگر کچھ دنوں بعد اسے انہیں بھانا پڑا کہ وہ لڑکی والدین کی یہ شرط تھی۔ وہ بیٹی کو راشد سے تباہی بپا ہیں گے جب راشد کی والدہ باقاعدہ رشتہ ڈالنے آئیں گی۔

”اب پتہ چلا ماں لیا ہوتی ہے۔“ میری ساس نے کمر پر ہاتھ ٹکا کر جس انداز میں کہا تھا۔ وہ انداز ماں کا ہر گز نہیں ہو سکتا۔

”پھر آپ چلیں گی میرے ساتھ؟“ راشد کو ہتھیار ڈالنا پڑے تھے۔

”میں تو کبھی نہ جاؤں گی۔ تجھے پہلے کہہ چکی ہوں اور روز روز فیصلے بدلنے کی میں عادی بھی نہیں ہوں۔“

”مگر وہ لوگ اس طرح تو رشتہ دینے پر تیار نہیں۔“ راشد جھلا کر بولا تھا۔

”نہ دیں میری بلا سے۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا ہے۔ تیرے لیے لڑکی اپنی پسند سے لاؤں گی۔“

ہونہہ! شریف نظر آنے کی اداکاریاں۔ ارے جن کی آوارہ بیٹیاں خود لڑکے پھاستی پھرتی ہیں۔ اب وہ کہہ رہے ہیں جب تک لڑکے کے بزرگ نہیں آئیں گے۔ رشتہ نہیں ڈالیں گے ہم لڑکی نہیں دیں گے فتنے منہ۔ میری طرف سے جائیں جنم میں۔ میں

کبھی نہیں جاؤں گی ان سے کہہ دو کوئی اور یہ تو فتنہ دیکھیں۔“

”آپ اس لڑکی سے ملی بھی نہیں اور کیسے کہے الزام لگا رہی ہیں اوہ ہاں یاد آیا۔ آپ کے لیے یہ مشکل بھی نہیں۔ اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ انہیں تو خود اپنی پسند اپنی مرضی سے بیاہ کر لائی تھیں جب انہیں نہیں بخشا تو پھر ثوبیہ کے لیے کیا امید رکھی جاسکتی ہے۔“

ماں کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔ جیسے کہہ رہی ہوں تو پھر تم جو کر سکتے ہو کر لو اور راشد پر پختہ ہوئے چلا گیا۔

”اماں! آپ ایک بار اس لڑکی کو دیکھ تو لیں۔“ واثق نے بھانا چاہا۔

”دیکھے گی میری جوتی“ کہہ دیا ماں۔ اسے کبھی ہو نہیں بناؤں گی۔ اس کے خزانہ ماں باب کی عین جوت

دل میں لے کر ہی دنیا سے انھیں گے کہ عظمت بیکم رشتہ ڈالنے آئے گی اور تو میسنی ساری کارروائی دیکھ رہی ہے۔ جانف ہو شکل کے کبہ کو دارا۔ بے جا روچے میں میری جانب تھا اور میرے لیے اسی میں عافیت تھی کہ منظر سے ہٹ جاؤں۔

”اماں! ہر وقت زرین کے پیچھے مت بھاگ کریں۔“ یہ آواز واثق کی تھی۔ اور ماں کے بعد وہ

بنگامہ ہوا کہ خدا کی پناہ۔ دردانہ کی سرگرمیاں انہیں مشکوک تھیں مگر میری

ساس کو یا تو اس پر اندھا یقین تھا یا پھر انھوں نے جان بوجھ کر اس کی طرف سے آنکھوں بند کر رکھی تھیں۔

میں نے اس کے کسی معاملے میں بوسنا تو کیا تھا کبھی تو میں رہنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ لڑکی میری بیٹی کی

قابل تھی اور مجھے اس کی صورت سے بھی نفرت تھی۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں اسے کئی بار قتل کر چکی

تھی اور عملی طور پر میری اور اس کی بول چال بالکل بند تھی۔ میرے بولنے نہ بولنے سے ان سب کو کوئی فرق

نہیں پڑتا تھا۔ دونوں بہنیں میرے سامنے میرا مذاق اڑاتی تھیں اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی تھی۔

اور دکھ کے رنگ دیکھنا ہی میری زندگی کی اولین تمنّا ہے۔ میں جو اپنے ہی گھر میں اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتی تھی۔ مجھ سے گھر کے سارے کام کروائے جاتے تھے مگر میری سانس ہانڈی خود بنا تیں اور مجھے خود ہی کھانا نکال کر دیتی تھیں۔ صبح کا ناشتا میں بناتی تھی۔ واثق پہلے ہی ناشتا کر کے آفس جا چکا ہوتا اور میری باری بعد میں آتی کہ صبح کے اتنے بکھیروں میں ان کے ساتھ بیٹھ کر میں کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔ دوپہر میں وہ آفس میں ہی کھانا کھاتا تھا اور میرے لیے میری سانس نیا تلا نکالتی تھیں۔ ہاں رات میں سب مل کر کھانا کھاتے۔ سب کچھ میرے سامنے ہوتا مگر سانس کی کڑی نگاہ بھی مجھ پر ہی ہوتی تھی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہاتھ روک لیتی تھی۔

اس حالت کی صبح پہلے گزرنے والی ہر صبح سے مختلف تھی۔ میں اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کر رہی تھی۔ واثق کو ناشتا دیتے ہوئے میں نے ایک انڈا اپنے لیے بھی فرائی کر لیا اور کچن میں ہی کھڑے کھڑے کھالیا۔

جب دونوں لڑکیاں ناشتا کرنے میں تودونوں نے فرائی انڈے کا آرڈر دیا۔

”انڈا تو ایک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ میری سانس اسی وقت اپنے ناشتے مکے لیے کچن میں آئی تھیں بولیں۔

”میں نے رات کو فریج دیکھا تھا۔ تین انڈے موجود تھے۔ ایک تم نے واثق کو دے دیا۔ ایک موجود ہے۔ ایک کہاں سا؟“

”وہ میں نے کھالیا۔“ میرا طمینان جوں کا توں تھا۔ ”کیوں؟ منجوس بھوکے خاندان کی بھوکی لڑکی! تجھے پتہ نہیں تھا۔ لڑکیوں نے صبح کالج جانا ہے اور وہ ناشتے میں انڈا لیتی ہیں۔“

عادت کے مطابق وہ اونچی آواز میں برسنے لگیں۔ واثق کمرے سے نکل آیا جب ماں کے گرجنے برسنے کی وجہ معلوم ہوئی تو واپس اپنے کمرے میں گیا۔ اپنا ناشتا اٹھایا اور لا کر رڑے بہنوں کے سامنے بیچ دی۔

راشد پورے دو مہینے گھر نہیں آیا۔ واثق نے بتایا۔ ”وہ باہر چھ سے ملتا رہتا ہے، وہ شادی ثوبیہ سے ہی کرے گا۔ میں ثوبیہ سے بھی ملا ہوں اور اس کے والدین سے ملنے ان کے گھر بھی گیا تھا۔ وہ واقعی شریف اور عزت دار لوگ ہیں۔ اکیلے لڑکے کو بیٹی دیتے ڈرتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ میں راشد کا بڑا بھائی ہوں اور ثوبیہ کا رشتہ ڈالنے آیا ہوں۔“

”کہنے لگے، ہمیں کوئی اعتراض تو نہیں مگر بات عزیز رشتہ داروں کی بھی تو ہے۔ آپ کے ہاں سے کوئی عورت رسم کے لیے آتی تو کسی کو بات بنانے کا موقع نہیں ملتا۔“

واثق نے کہا۔ ”جی کی خواہش سر آنکھوں پر

جب ہم رسم کرنے آئیں گے تو میری بیوی بھی ساتھ ہوگی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو واثق! مال تو مجھے جان سے مار رہی ہے۔“ میں نے سنا تو پوری جان سے لرز گئی۔

”ٹھیک ہے، وہ میری ماں ہیں ان کا احترام مجھ پر فرض ہے لیکن ذرا ان کی غلط باتوں کو غور کرو۔“ میرا دل بھی جھٹکا ہے۔ تم بھی انہیں عزت تو دو۔

واثق کا لہجہ اتنا کتنا ہی کافی تھا۔ مجھے اپنے اندر بے طرح توانائی اترتی محسوس ہوئی۔ اور میں نے کہہ دیا۔

”میں ضرور راشد کی منجوسی کی رسم ادا کرنے چلوں گی۔“

”تم ایسا کرنا، پرسوں ایک ہفتے کے لیے اپنے میکے چلی جانا۔ ثوبیہ کا جوڑا انگوٹھی اور تمہاری شاپنگ ہم لوگ وہیں رہ کر آرام سے کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ واثق نے راہ بھجائی تو میں نے جوش کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

واثق تو پورا پلان سمجھا کر سو گئے۔ مگر میں سچ کہتی ہوں ان لوگوں کی شکست کا احساس اور وہ بھی میرے ہاتھوں مجھے اتنی خوشی دے رہا تھا کہ نیند نہیں آرہی تھی۔ ان دنوں مجھے یوں لگتا تھا ان کے چہروں پر ادا

”تم نے اپنا ناشتا کیوں چھوڑ دیا۔ پوچھو اس ندیدی“
اس لالچن سے۔ اندانہ کھاتی تو کیا موت آرہی تھی
اسے۔ تم نے اسے بہت سرچڑھا رکھا ہے۔“
واثق نے ماں کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور
مجھ سے بولا۔

”تم ابھی تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں تمہارے میکے
چھوڑ دیتا ہوں۔“
”نہیں واثق! جو پروگرام بنا ہے، میں اس کے
مطابق ہی جاؤں گی۔“

”مگر یہاں اب سارا دن تم ریشاں رہو گی۔“ واثق
کا اشارہ ان کے رویوں کی جانب تھا۔
”یہ میرا گھر ہے واثق! میں کل پروگرام کے مطابق
ہی جاؤں گی۔“

حقیقت میں مجھے واثق کی باتوں اور اس کے ساتھ
نے مضبوط بنا دیا تھا اور میرے اندر کی نفرت ان لوگوں
کی ہار دیکھ کر لطف اندوز بھی ہونا چاہتی تھی۔ واثق نے
ناشتا کیے آفس چلا گیا۔

میری ساس نے خلاف توقع مجھے کچھ نہیں کہا۔
خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئیں۔ یہاں یہ
دونوں بہنیں بولتی نہیں مگر میں نے پروا نہیں کی۔
”تم کیا سمجھتی ہو۔ امی تمہیں معاف کر دیں گی۔
یار رکھنا جو بڑھ بڑھ کر گھر والی ہوئے کے دعوے کر رہی
ہوئیں۔ ایسی سزا دیں گے کہ تڑپ تڑپ کر جانے لگی۔“

دردانہ دھمکی دے رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ
ابھی تو راشد کی شادی کی خبر سن کر وہ لوگ اپنی بے بسی پر
کتنا جلیں کڑھیں۔ یہ سارا دن میری ساس نے
خاموشی سے گزارا اور اگلے روز میں میکے آگئی۔

شام میں واثق کے ساتھ ساتھ راشد بھی آجاتا۔
ہم لوگ مل کر بازار جاتے اور شاپنگ کرتے۔ یہ دن
بہت اچھے تھے ہم تینوں بہت خوش تھے اور وہ دن بھی آ
پہنچا جب میں واثق واثق اور راشد کے دوستوں کے
ساتھ راشد کی سسرال پہنچے۔

نوبیہ کو انگوٹھی پہنائی گئی اور وہ راشد کی ہو گئی۔

نوبیہ اور اس کے گھر والے مجھے بھی اچھے لگے اور میں
نے راشد کو پورے خلوص کے ساتھ مبارکبادیں دیں۔

”اب آپ نے بری کی تیاری کرنا ہے۔ شادی بھی
تو آپ ہی کروائیں گی نا!“
”ضرور، اگر واثق میرے ساتھ ہیں تو پھر مجھے کیا
ڈر نہیں۔“

اگلے روز میں سسرال واپس آگئی۔ گھر میں سسرال
کی خاموشی بھی مگر میں گزشتہ ایک ہفتے کی گماں میں
ہی ابھی تک انجوائے کر رہی تھی لہذا میں نے کچھ زیادہ
محسوس نہیں کیا۔ ہاں واثق ضرور حیران ہوا تھا۔

اگلے روز دوپہر کو جب میں مشین لگا کر کپڑے
رہی تھی۔ میری ساس نے مجھے کچن میں بلایا اور ہاتھ
بنانے کو کہا۔ یہ ایک نئی بات تھی مگر میں نے سسرال
جو اب تو کیا کرنے تھے۔ خاموشی سے چلی آئی۔

جو کچن میں داخل ہوئی۔ دروازہ دھماکے سے
میں پلٹی مگر یہاں موجود میری دونوں نندوں نے مجھے
میں میں لے لیا اور پھر میری ساس نے میری
پیل کی بول اٹھائی۔ بڑی والی نے میرے منہ پر ہاتھ
رکھا۔ مگر میری ساس کو منصوبے میں اچانک کسی
جھول احساس ہوا۔ سرنفی میں ہلا کر پلٹ کر دی اور
بولیں۔

”یہ تو شور و حال ہے کی تو ایسا کر چھوٹی!“۔ اتنی دیر
میں کسی انہونی کے احساس سے میں ان کی گرفت میں
بری طرح پھنسل رہی تھی اور بڑی کا ہاتھ میرے منہ پر
ہونے کے باوجود میری گھٹی گھٹی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔
میں بری طرح پھنسل رہی تھی اور ان کی گرفت سے
پھسل پھسل جاتی تھی۔

پھر باہر کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ میری ساس
کے ہاتھ سے ماچس گر پڑی پھریوں لگا کچھ لوگ دیوار
پھلانگ کر اندر آ رہے ہیں اس سے پہلے کہ وہ دونوں
مجھے چھوڑیں اور ان کی سمجھ میں کچھ آتا۔ محلے کے
تین چار لڑکے کچن تک آ گئے۔

”یہ کیا کر رہی تھیں تم خالہ! گھر کی بہو کو جلادی

نفاست اور

IN PULP

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

MOVIE TA
Super Soft

MOVIE TA

Perfumed & Printed

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Super Soft

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Perfumed Sand

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Mod

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Mod

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Party

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Party

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Super Soft

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Super Soft

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Super Soft

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Super Soft

ایکسٹرا ملٹم، ایکسٹرا سٹائٹ

Super Soft

تھیں۔ چلو تھانے۔

پھر شاید دروازہ بھی کھول دیا گیا تھا۔ محلے کی عورتیں بھی اندر آ رہی تھیں۔ ہر کوئی ان ماں بیٹی کو لعنت ملامت کر رہا تھا اور میں سکتے میں تھی۔ اخبار میں بہت بار ایسی خبریں پڑھی تھیں مگر کبھی میں بھی ان کا حصہ بن جاؤں گی یہ نہیں سوچا تھا۔ محلے کی عورتیں ہی سہارا دے کر مجھے چارپائی تک لائیں اور پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگایا۔

”منصوبہ تو ان کا مکمل تھا مگر یہ کچن کی کھڑکی بند کرنا بھول گئی تھیں۔ میں سامنے والی چھت پر اپنے دوستوں کو اپنے نئے کبوتر دکھانے کے لیے چڑھا تھا۔ بس اللہ نے بھالی کو بچانا تھا۔ میری نظر کھلی کھڑکی کی جانب اٹھ گئی اور معاملہ سمجھنے کے بعد میں نے اور میرے دوستوں نے ایک سکنڈ کی دیر نہیں کی۔ وہ جو میرے لیے خیر گشتہ بن کر آیا تھا۔ سب کو خدا ہوا تھا پھر کسی نے واثق کو فون کر دیا واثق اور راشد دونوں جب گھر میں داخل ہوئے تو ہمارے گھر کا صحن محلے کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں بری طرح خوفزدہ تھی اور بار بار چلانے لگی تھی۔

”اپنی بیوی کو یہاں سے لے جاؤ۔ تمہاری ماں اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔“ ہر ایک کا یہی مشورہ تھا۔

مجھے نہیں پتہ راشد اور واثق کے بعض ماں بہنوں کو کیا کیا کہا۔ بہر حال میں ایک بار پھر میکے آگئی۔ مجھے خود کو سنبھالنے میں کافی دن لگ گئے۔

واثق نے کہا ”تم ٹھیک ہو جاؤ پھر میں کوئی گھر دیکھتا ہوں۔ راشد کہتا ہے ہم دونوں مل کر رہیں گے۔ بس تم اب ثوبیہ کے لیے بھی تیاری شروع کر دو۔“

”واثق! اگر اس روز وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتیں تو؟“ میں یہ سوال دن میں کتنی ہی بار ان سے کرتی۔

پورے پندرہ دن بعد جب ثوبیہ کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔ واثق تیز قدموں سے گھر میں داخل ہوتے ہوئے بتایا تھا۔

”امی ہسپتال میں ہیں۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں۔“

”کیا ہوا ہے انہیں؟“

”وہ جل گئی ہیں بہت بری طرح جل گئی ہیں۔ یہ قدرت کا انصاف ہے زرین! مکروہ میری ماں ہیں۔ ہمیں انہیں دیکھنے تو جانا ہی چاہیے۔“

اور میں نے انکار نہیں کیا۔ میری ساس کی حالت بہت بری تھی۔ کاشفہ نے بتایا تھا۔ لائٹ بند ہونے پر انہوں نے کمرے میں موم بتی جلائی تھی پھر وہ سو گئیں شاید موم بتی میز پر گری تھی اخبار کو آگ لگی اور میز بستر کے بالکل ساتھ لگی تھی۔ یوں بستر نے آگ پکڑ لی اور مجھے جلائے کا منصوبہ بنانے والی دھڑ دھڑ آگ میں جلنے لگی۔

ان کی حالت دیکھ کر میں ایک بار پھر کانٹ گئی اور اپنے رب کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ میں نے مجھے اس اذیت سے بچالیا تھا۔ میں نے واثق سے کہا۔

”الگ گھر نہیں میں اسی گھر میں رہوں گی۔“

میری ساس پورا ایک مہینہ ہسپتال میں رہ کر واپس آئیں۔ گھر دوبارہ آئیں تو میں وہاں موجود اور سیاہ سفید کی مالک تھی۔ میری ساس چلنے پھرنے سے معذور ہو چکی تھیں اور دایاں ہاتھ بھی ٹکڑا ہو چکا تھا مگر مجھے لگا رہا تھا کہ مجھے اس گھر میں یوں مالکانہ اعتماد کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ہواشت نہیں کر پار ہیں۔ اور میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔

ٹھیک تین دن کے بعد جب نیا مہینہ شروع ہوا انہوں نے واثق سے پوچھا۔

”تم نے ابھی تک تنخواہ میرے ہاتھ پر لا کر نہیں رکھی۔ کب تک لا کر دو گے؟“

”امی! تنخواہ میں زرین کو دے چکا ہوں۔ اب وہی گھر چلائے گی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

آپ اب ان فکروں کو چھوڑ دیں۔

”میرے جیتے جی میرے گھر کی مالکین کوئی اور نہیں ہو سکتی اور یہ کلمہ ہی تو کبھی بھی نہیں۔“

”میں تو الگ گھر لینے کا فیصلہ کر چکا تھا امی! آپ اب

خود ہی سوچ لیں۔ ہم اگر الگ ہو جاتے ہیں تو پھر میں آپ کو خرچ کے لیے کتنی رقم دے سکتا ہوں بہت مشکل ہو جائے گا آپ کا گزارا۔“

”ارے چھوڑو میاں! اس عورت کا دماغ ہمیشہ سے خراب رہا ہے۔“ میرے سر کو یقیناً ”میری ساس کی معذوری نے دلیر بنایا تھا ورنہ وہ تو صبح کو سر جھکا کر جو گھر سے نکلتے تو شام ڈھلے اسی مسکین انداز میں لوٹا کرتے تھے۔“

”آپ سوچ لیں امی! ورنہ پھر ہم دو سرا گھر دیکھتے ہیں۔ راشد بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔“

واثق کے کہہ کر جانے کے بعد میری ساس نے کہا۔

”الگ گھر کے خواب اب بھی ہیں یہاں رہنے کی صورت میں مالک بن کر رہنا چاہتی ہے۔ تو مجھے جانتی نہیں ہے۔ میں ذرا میرے زخم ٹھیک ہونے دے۔ کرتی ہوں تیرا بندوبست۔“ مگر اس بار آواز میں پہلے والی گھٹن گرج نہیں تھی۔

”اپنا ہی روبرو ہے مالک ہی رہا ہے۔ راشد کو روکو جو اگلے مہینے سادی کر رہا ہے۔“

”میں نے کس نے کہا؟“ وہ چونکیں۔

”لو مجھے کون کہتا۔ اس کی منگنی کی رسم میں میں ہی تو شریک ہوئی تھی اور پری بھی میں نے بنائی ہے۔“

انہوں نے قریب رکھا گلاس مجھ پر پھینکا مگر میں جھپکاٹی دے گئی اور بولی۔

”خبردار تمیز سے رہو۔ اگر بد تمیزی کرو گی تو تم تینوں ماں بیٹی کو آج سارا دن کھانا نہیں ملے گا۔ تالا ڈال دوں گی چین کو۔“

انہوں نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ میں سر جھٹکتے ہوئے کچن میں آگئی اور وہیں سے اونچی آواز میں کہا۔

”اپنی بیٹیوں سے کہہ دو۔ پلنگ توڑنے کی اجازت نہیں۔ کچھ ہاتھ پیر ہلا میں گی۔ تب ہی کچھ کھانے کو دوں گی۔“

اب گھر پر میری حکومت تھی گو کہ سکون اب بھی

نہیں تھا۔ میری ساس سارا دن چلا چلا کر مجھے کوسا کرتی تھیں اور ان کی بیٹیاں کسی کام کو ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھیں۔

انہی دنوں میں نے ٹوپیا کے گھر والوں کو کھانے پر بلا لیا۔ واثق کی اس روز آفس سے چھٹی تھی اور راشد بھی صبح سے ادھر آ گیا۔

”آ میں تو وہ لوگ ادھر۔ وہ وہ سناؤں گی کہ دو منٹ بھی ادھر ٹپک گئے تو میرا نام بدل دینا۔“

میری ساس کو جب پتہ چلا کہ یہ تیاریاں کن لوگوں کی آمد پر ہو رہی ہیں تو قریب پڑی میز پر دھری ہر چیز اٹھا کر فرش پر دے ماری اور چیخ پکار کرنے لگیں۔

مگر راشد نے پہلے ہی منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ وہ پہرے کھاتے میں اس نے کوئی دو ملا دی تھی۔ وہ کھاتے ہی سو گئیں اور ان کی آنکھ اگلے روز صبح کو ہی کھلی۔ جب مہمان ایک بہت اچھی شام گزار کر کبھی کے رخصت بھی ہو چکے تھے۔

ان دنوں دونوں بہنیں بغیر ناشتے کے کالچ جانے لگیں۔ اس کے بعد تو یہ معمول بن گیا کہ کبھی ناشتا نہیں کرتی تھیں تو کبھی دوپہر کا کھانا نہیں کھاتی تھیں۔

”آخر یہ کھانا کہاں سے کھاتی ہیں ان کے پاس اتنے پیسے تو نہیں کہ روز روز اپنی جیب سے خرچ کر سکیں گون ہے کیا دردناک کاٹوئی پرانا چاہنے والا؟ میرا ماتھا ٹھنکا مگر میں واثق سے اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے پہلے والا تجربہ یاد تھا۔ میں سمجھ گئی تھی۔ واثق کو بہنوں پر اندھا اعتماد ہے۔“

آخر بہت سرچ کر میں نے دردناک سے براہ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے دھمکی دی اگر مجھے کوئی سرا بھی ہاتھ آیا جس سے یہ ثبوت ملا کہ وہ پرانی روش برقرار رکھے ہوئے ہے تو میں اس کے بھائیوں کو بتانے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔

”کون سی روش؟ میں جانتی ہوں۔ میری ماں جانتی ہے ہم کیا ہو۔ رنکے ہاتھوں پکڑا تھا میں نے نہیں۔“

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈھٹائی سے کہہ رہی تھی۔ مجھے پسپا ہونا پڑا تھا۔

اس کی مکاری پر مجھے حیرت بھی تھی اور شدید غصہ بھی۔ میں گھر میں تکرار سے ہمیشہ گریز کرتی آئی تھی مگر اس لڑکی نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں اب اکیلے کام کرتے ہوئے انہیں مزے سے بیٹھے دیکھ کر چلانے لگتی تھی اور ایسے ہی ایک روز جب میں ان پر برس رہی تھی۔ واثق گھر آگیا مجھے پتہ بھی نہیں چلا ان کے سامنے واثق نے مجھے کچھ نہیں کہا لیکن کمرے میں آکر سمجھانے لگا۔

”کوئی کام نہیں کرتیں۔ بالکل بات نہیں سنتیں۔ میری طبیعت بھی آج کل ٹھیک نہیں رہتی۔“

”آخر امی جان کے سارے کام وہی دیکھتی ہیں۔ کلج جاتی ہیں۔ آکر بڑھائی کو بھی ٹانگ دیتی ہیں اپنے کسی کام کے لیے بھی تمہیں مجبور نہیں کرتیں۔“

واثق نے یقیناً خاموشی سے ہر بات کا جواب دے رکھا تھا۔ میں خاموش ہو گئی۔

اس واقعے کے تیس دن جب میری ان دونوں بہنوں سے بات چیت بالکل بند ہو چکی تھی دردانہ صبح اکیلی ہی کچن میں ناچنے کے لیے آئی۔ میں نے کاشفہ کے بارے میں کچھ پوچھا۔ واثق نے پوچھا اس نے بتایا۔

”کاشفہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ہم دونوں بہنیں اسی وجہ سے ساری رات جاگتی رہیں۔“

”تم مجھے جگالتیں۔ میں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔“

”چھوڑیں بھیا! ہم سے بات کرنے کے لیے مجھے

آپ کو کسی کی اجازت درکار ہے۔ بہت بدل گئے ہیں آپ۔“ اس نے طنز بھرے انداز میں کہا۔ میں برداشت نہیں کر سکی اس کی جانب پلٹی مگر واثق نے ہاتھ اٹھا کر مجھے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔

”میں اب بھی تمہارا وہی بھائی ہوں۔ تم اپنا ہر مسئلہ مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔“

واثق کے انداز میں محبت ہی محبت تھی۔ جواب میں دردانہ نے شکریہ ادا کیا پھر جلدی جلدی ناشتا کرنے لگی۔ واثق آفس اور وہ کلج چلی گئی۔ کاشفہ اس کے جانے کے بعد کمرے سے نکلی اپنا اور امی کا ناشتا لیا اور

پھر کمرے میں چلی گئی۔

میں اپنے کام کلج میں مصروف ہو گئی۔ یہ دونوں بہنیں دو ڈھائی بجے تک کلج سے لوٹ آیا کرتی تھیں مگر آج تین بج چکے تھے اور دردانہ کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ میری ساس پریشان ہو رہی تھیں۔ میرے سر بھی گلی کے پاہر تک کئی چکر لگا آئے تھے جبکہ کاشفہ یہی کہہ رہی تھی۔

”ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی وہ آجائے گی۔“

چار بجے کے قریب واثق بھی گھر آگیا۔ انہیں بھی جوان بہن کی ابھی تک واپسی کا نہ سن کر شک لگا۔

”یہ سب تمہاری بیوی کا کیا دھرا ہے۔ اسی کے سلوک نے میری بچی کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

میری ساس اس نے نازک وقت پر بھی وار کرنا نہیں بھولیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ کاشفہ بھی برونے لگی اور

ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔ یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ واثق مجھ سے پوچھ گچھ کرنے بیٹھ جاتا۔ وہ سخت الجھا ہوا تھا۔ راشد کو بھی بلوایا گیا اور دونوں بھائیوں نے ہر

کس طرح سے اس کی تلاش شروع کر دی۔ وہ دن پھر رات بھی سرور گئی مگر دردانہ کا کوئی ایسا پتا نہ ملا۔

”مجھے اسے یہ توقع ہر گز نہیں تھی۔ اعتماد کیا تھا تم پر اور تم نے کتنا غلط فائدہ اٹھایا ایسی بد سلوکی کی کہ میری

بہن گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ کاشفہ کہہ رہی ہے۔ وہ کئی بار خودکشی کی باتیں کرتی تھی۔ واثق مجھ سے

برگشتہ ہو رہا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا واثق! یہ مجھ پر الزام ہے۔“

مگر بازی ایک بار پھر میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ واثق مجھ سے بری طرح بد ظن ہو رہا تھا ادھر میری

حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ ایسے میں شوہر کا رویہ مجھے بری طرح توڑ رہا تھا۔

آخر ساتویں روز تھانے سے اطلاع آئی کہ دردانہ مل گئی ہے۔ واثق اور راشد اسی وقت تھانے چلے گئے اور میں نے کاشفہ کو بے چینی سے برآمدے میں ادھر

رج میں مصروف ہو گئی تھی۔
تک کالج سے لوٹ آیا کرتی تھی اور دردانی کی واپسی میں نشان ہو رہی تھیں۔ میرے کئی چکر لگا آئے تھے جبکہ

سا ہوئی وہ آجائے گی۔
واثق بھی گھر آگیا۔ انہیں واپسی کا نہ سن کر شک لگا۔ بیوی کا کیا دھرا ہے۔ اسی لکھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے

ک وقت پر بھی وار کرنا نہیں کہ کاشفہ بھی رونے لگی تھی۔ یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ نے بیٹھ جاتا۔ وہ سخت الجھ گیا اور دونوں بھائیوں نے تلاش شروع کر دی۔ وہ دن نہ کا کوئی ایسا پتا نہ ملا۔

گز نہیں تھی۔ اعتماد کیا تھا نہ کیا ایسی بد سلوکی کی کہ میری گئی۔ کاشفہ کہہ رہی ہے۔ رتی تھی۔ واثق مجھ سے

یا واثق! یہ مجھ پر الزام ہے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ ظن ہو رہا تھا ادھر میری ایسے میں شوہر کا رویہ

سے اطلاع آئی کہ دردانی وقت تھا نے چلے گئے سے برآمدے میں ادھر

سے ادھر چکر لگاتے دیکھا وہ کبھی ہاتھ مسلتی تھی۔ کبھی ہونٹ کاٹنے لگتی۔ ایسے میں اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں اس کا جائزہ لے رہی ہوں۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد دونوں بھائی دردانی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ گھر آتے ہی واثق نے دردانی کے منہ پر دو تین طمانچے دے مارے پھر لا کر اسے ماں کے سامنے پھینکا اور بولا۔

”آپ تو کہتی تھیں یہ زرین کے سلوک سے دلبرداشتہ ہو کر گھر سے خود کشی کے ارادے سے نکلی ہے تو پھر بٹائیے مجھے خود کشی کے لیے جاتے ہوئے اسے زیور اور روپے کی ضرورت کیوں پیش آگئی تھی؟“

”کون سا زیور؟ کون سا روپہ؟“
پتہ نہیں میری ساس انجان تھیں یا بن رہی تھیں۔ ہاں کاشفہ سب جانتی تھی۔ اس کا مجھے پورا یقین تھا۔ میرے شوہر نے اسی وقت اس کی الماری کا کھولا۔ وہاں سے زیور روپہ سب نکلے تھے۔

سب واپس تو مل گیا ہے نا؟“ میری ساس نے پوچھا۔
”نہیں یہ جس کے پیچھے نکلی تھی وہ سب کے سب اسے چھوڑ گیا ہے۔“ راشد نے آگے بڑھ کر دردانی کو ایک اور طمانچہ دے دیا کرتے ہوئے بتایا تھا۔

”ہائے میرا زیور! ہائے میرے روپے!“ میری ساس سینہ کو پی کرنے لگیں۔

اس واقعہ کے بعد میرے سر صرف دو ماہ زندہ رہے۔ محلے میں یہ بات پھیل گئی تھی کیونکہ معاملہ پولیس اسٹیشن تک چلا گیا تھا اور پولیس پوچھ گچھ کے لیے محلے میں آئی تھی۔ عورتیں دن بھر آتی رہتیں اور طرح طرح کے سوال کرتی رہتیں۔ واثق نے بولنا بہت کم کر دیا تھا اب وہ گھر سے نکلنے سے کتراتا تھا۔

چھ ماہ بعد میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا اور بچے نے واثق کو ایک بار پھر زندگی کی جانب متوجہ کر دیا۔ پھر دو سال بعد دوسرا بیٹا ہوا۔ میری ساس دنیا سے چل بسیں۔ حالات بالکل بدل گئے۔ اب یہ گھر میرا ہے۔ میں یہاں کے سیاہ سفید کی مالک ہوں۔ ان لڑکیوں کی غلط

حرکتوں نے انہیں دونوں بھائیوں کی نظروں سے گرا دیا ہے۔ وہ ان پر بالکل اعتبار نہیں کرتے۔

محلے والے آج تک اس واقعہ کو نہیں بھولے اور رہی میں تو مجھے ان دونوں سے کوئی ہمدردی ہے نا دلچسپی ان کی عمریں شادی کی ہیں مگر میں نے کبھی کسی سے ان کے رشتے کے لیے نہیں کہا۔

”اب تو سب کچھ ٹھیک ہو چکا تم اپنی دنیا میں خوش ہو۔ انہیں معاف کر دو۔“ فردوس بیگم نے یہ سب سن کر دھیرے سے کہا تھا۔

”مجھے پتہ تھا آپ یہی کہیں گی۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔

ایک انسان جو زندگی کے بہترین سال ظلم کی چکی میں پھنسے ہوئے گزار دیتا ہے جب اس کا وقت آتا ہے تو اسے معاف کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ مگر کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ ہم انسان ہیں فرشتے نہیں ہیں اور پھر یہ تو میری بیٹی کی قابل ہے۔ وہ رحمت جو ایسی رو تھی کہ دوبارہ میری جھولی میں نہیں آئی۔“

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو زرین! ہم انسان ہیں فرشتے نہیں! اب تو ایک عمر دکھوں کی لگ میں جانے والے کا دل تو سب سے پہلے جل کر خاک ہو گیا ہے۔“ گھر آتے ہوئے وہ سوچتی رہیں ان دونوں کے اپنا مقدر خود لکھا۔ ان کی اس نے بربادی اپنے ہاتھوں چنی۔ کسی کی بیٹی کو باعزت مقام کے ساتھ گھرا کر تذلیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا کی چال کا خیال تک نہیں آتا۔ گھر جو امن و سکون کا گہوارہ ہونا چاہیے سیاستوں اور نفرتوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ میں زرین سے کس طرح کہوں۔ انہیں معاف کر دو کہ زرین کی مامتا کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ اس کے کردار پر سیاہی پھیری گئی ہے اسے زندہ جلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیا ہم میں سے کوئی بھی ایسے سلوک کے بعد معاف کر دینے کا حوصلہ رکھتا ہے؟ تبھی نہیں مگر ہم وقت کی آواز کو سننا چاہیں تو سن سکتے ہیں۔ ظلم کرنے سے پہلے اگر ایک لمحے کو ٹھہر کر سوچ لیں تو گھر امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ یہ کچھ

مشکل تو نہیں صرف سوچنے کی بات ہے۔